انسدادِ سود کا مقدّمہ — ہم کہاں کھڑے ہیں؟

یہ بات ایک اٹل حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں کہ پاکستان اسلام کے نام اور کلمہ طیّبہ کے اعلان واقرار پر وجود میں آیا۔ لاکھوں جانوں کی قربانی اور ہزاروں عصمتیں لٹوانے کے بعد قائم ہونے والے ملک میں اسلامی شریعت کے علاوہ کسی دوسرے قانون کی بالادستی نہ عقلاً قابلِ تسلیم ہے اور نہ شرعاً قابلِ قبول۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کا پاکستان کے لیے ایک اسلامی فلاحی مملکت کا وژن اُن کے دسیوں خطابات سے واضح ہوجاتا ہے جوانہوں نے تحریک پاکستان کے لیے جِدّوجُہد کے دوران اور بعد میں ارشاد فرمائے۔

۱۹۴۸ء میں سٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے قائد کا یہ بیان تاریخی ریکارڈ کا حصہ ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"I shall watch with keenness the work of your Research Organization in evolving banking practices compatible with Islamic ideas of social and economic life. The economic system of the West has created almost insoluble problems for humanity and to many of us it appears that only a miracle can save it from disaster that is not facing the world. It has failed to do justice between man and man and to eradicate friction from the international field. On the contrary, it was largely responsible for the two world wars in the last half century. The Western world, in spite of its advantages, of mechanization and industrial efficiency is today in a worse mess than ever before in history. The adoption of Western economic theory and practice will not help us in achieving our goal of creating a happy and contended people. We must work our destiny in our own way and present to the world an economic system based on true Islamic concept of equality of manhood and social justice. We will thereby be fulfilling our mission as Muslims and giving to humanity the message of peace which alone can save it and secure the welfare, happiness and prosperity of mankind..."

جناب قائد کا یہ بیان ایک نوع کا پالیسی سٹیٹمنٹ ہے جو اپنے مفہوم اور مُدّعا میں بالکل واضح اور غیر مبہم ہے۔ پاکستان کے مرکزی مالیاتی ادارہ کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے اس اصولی موقف کا اظہار اس امر کا غمّاز ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی آئینی تاریخ اور سود کی حرمت کا مسئلہ بالکل آغاز ہی سے پہلو بہ پہلو رہا ہے۔

۱۹۵۶ء کے آئین اور ۱۹۶۲ء میں تشکیل پائے جانے والے آئین' دونوں میں صاف اور غیر مبہم طور پر یہ بات درج تھی کہ حکومتِ پاکستان نظامِ معیشت سے سود کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرے گی۔ اس کے بعد ۱۹۷۳ء کے آئین' جو کہ ہماری تاریخ کا متفقہ آئین اور دستور مانا جاتا ہے' کے آرٹیکل 38 کی ذیلی دفعہ F میں کہا گیا ہے: ''حکومت جس قدر جلد ممکن ہو سکے ربا کو ختم کرے گی۔''

۱۹۶۲ء میں آئین کی تشکیل کے علاوہ قومی سطح پر اسلامی نظریاتی کونسل کے نام سے ایک دستوری ادارہ قائم کیا گیا' جس میں تمام مسالک اور مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے مستند علماء کرام کو نمائندگی دی گئی۔ اس ادارے کے فرضِ منصبی میں یہ بات شامل کی گئی کہ یہ ادارہ ایسی تجاویز مرتب کرے گا جن پر عمل کر کے پاکستانی عوام کی زندگیوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جا سکے۔

چنانچہ ۳ دسمبر ۱۹۶۹ء کو اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی آئینی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے اپنی ایک رپورٹ میں اتفاقِ رائے سے اس امر کا اظہار کیا کہ ''ربا اپنی ہر صورت میں حرام ہے اور شرح سود کی کمی بیشی سود کی حرمت پر اثر انداز نہیں ہوتی''۔ مزید یہ کہ ''موجودہ بینکاری نظام کے تحت اَفراد' اداروں اور حکومتوں کے درمیان قرضوں اور کاروباری لین دین میں اصل رقم پر جو اضافہ یا بڑھوتری لی یا دی جاتی ہے وہ ربا کی تعریف میں آتی ہے۔ سیونگ سرٹیفکیٹ میں جو اضافہ دیا جاتا ہے وہ بھی سود میں شامل ہے۔ پراویڈنٹ فنڈ اور پوسٹل بیمہ زندگی وغیرہ میں جو سود دیا جاتا ہے وہ بھی ربا میں شامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صوبوں' مقامی اداروں اور سرکاری ملازمین کو دیے گئے قرضوں پر اضافہ بھی سود ہی کی ایک قسم ہے' لہٰذا یہ تمام صورتیں حرام اور ممنوع ہیں۔''

کونسل کی مذکورہ بالا رپورٹ کے ۸ سال بعد ۱۹۷۷ء میں صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے کونسل کو ہدایت کی کہ کونسل ضروری تحقیق اور تفتیش کے بعد ایسے طریقے بھی تجویز کرے جن کو اپنا کر سود جیسی لعنت کا خاتمہ کیا جا سکے۔ چنانچہ کونسل نے بینک ماہرین' اقتصادیات کے ماہرین اور علماء سے طویل گفتگو اور مباحث کے بعد اور عالمی سطح پر اس مسئلے کی پیچیدگیوں کے گہرے مطالعے کے بعد ۲۵ جون ۱۹۸۰ء کو اپنی رپورٹ صدرِ پاکستان کے سامنے پیش کر دی۔ اس رپورٹ میں سود کو ختم کر کے اس کے متبادل نظام کی جملہ تفصیلات درج تھیں اور کہا گیا تھا کہ ان تجاویز پر عمل درآمد سے دو سال کے اندر اندر پاکستان کی معیشت سود سے مکمل طور پر پاک ہو سکتی ہے۔

اس رپورٹ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سعودی عرب کی کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کر کے اپنی حکومت' اہلِ علم اور عوام کے استفادے کے لیے شائع کیا۔ لیکن قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل ہونے والے ملک کی افسر شاہی نے اس رپورٹ پر عمل درآمد کے ضمن میں سنجیدہ کوششیں نہیں کیں اور کچھ نیم دلانہ انداز میں اور بہت ہی محدود پیمانے پر مشارکہ' مضاربہ' مرابحہ اور بیع مؤجل ایسے انداز سے متعارف کروائیں کہ خاطر خواہ نتیجہ اور خیر برآمد نہ ہو سکا۔ چنانچہ کونسل نے

ایک اور revised report تیار کی جن میں ان الفاظ میں تنبیہہ اور اظہارِ افسوس کیا گیا کہ ''کونسل نے ۸۱۔۱۹۸۰ء میں کیے جانے والے ان اقدامات کا جائزہ لیا جو حکومت نے اسلامی نظام معیشت کے نفاذ کے سلسلے میں انجام دیے ہیں' ان میں خاتمہ سود کے لیے کیے جانے والے اقدامات ان سفارشات کے بالکل برعکس ہیں جو کونسل نے تجویز کیں..... حکومت نے وہ طریقہ اختیار کیا جو مقصد کو فوت کرنے کا سبب بن گیا۔''

کونسل کی تنبیہات کا حکومتِ وقت پر جب کوئی اثر نہ ہوا تو ۱۹۹۰ء میں ایک پاکستانی محمود الرحمٰن فیصل نے وفاقی شرعی عدالت' جو کہ اسلامی قوانین کے مطابق اور اسلامی احکام کے تحت فیصلہ دینے کے لیے وجود میں لائی گئی تھی' میں ایک پٹیشن نمبر ۱/ ۳۰ داخل کی اور عدالت سے استدعا کی کہ رائج الوقت سودی نظامِ معیشت کو غیر اسلامی قرار دے کر اس پر پابندی عائد کی جائے اور حکومتِ وقت کو ہدایت کی جائے کہ پاکستان کے معاشی نظام سے سود جیسی لعنت کا خاتمہ کیا جائے۔ وفاقی شرعی عدالت نے اس کیس اور اسی سے ملتے جلتے ۱۱۴ دیگر کیسز کی مشترک سماعت کی۔ دورانِ سماعت بینکرز' اکانومسٹس' حکومتی نمائندوں اور علماء کو تفصیلی طور پر سنا' دقیق بحثیں کیں اور تحریری و زبانی بیانات حاصل کیے' اور اکتوبر ۱۹۹۱ء میں ۱۵۷ صفحات پر مشتمل اپنا تاریخی فیصلہ سنایا۔ اُس وقت کی وفاقی شرعی عدالت جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب بطور چیف جسٹس' جسٹس فدا محمد خان صاحب اور جسٹس عبید اللہ خان صاحب پر مشتمل تھی۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں نہ صرف یہ کہ سود کی ایسی تعریف متعین کی جسے معیار بنا کر مروّجہ نظامِ معیشت میں پائے جانے والے سودی معاملات اور آئین اور دستور میں مذکور سودی دفعات کا جائزہ لیا جا سکتا تھا' بلکہ رائج تمام سودی قوانین (۲۲ قوانین) کا جائزہ لے کر بینکنگ سمیت تمام سودی لین دین کو حرام قرار دیا اور وفاقی حکومت اور تمام صوبوں سے بھی کہا کہ وہ ۳۰ جون ۱۹۹۲ء تک متعلقہ قوانین میں تبدیلی کر لیں اور یہ بھی کہ یکم جولائی ۱۹۹۲ء سے تمام سودی قوانین غیر آئینی ہو جائیں گے اور تمام سودی کاروبار غیر اسلامی ہونے کی بنا پر ممنوع قرار پائے گا۔

وفاقی شرعی عدالت کے مذکورہ بالا فیصلے کو عوامی سطح پر زبردست پذیرائی ملی اور یہ امید پیدا ہو گئی کہ شاید پاکستان کے قیام کے ۴۵ سال بعد اب ہمارا معاشی قبلہ درست ہو جائے گا اور عوام کو سود جیسے استحصالی اور ظالمانہ ہتھکنڈے سے نجات مل جائے گی۔ لیکن دوسری طرف سود خوروں اور بینکوں کو فکر لاحق ہو گئی کہ ان کا پھیلایا ہوا سودی قرضوں کا جال کہیں کمزور نہ پڑ جائے اور حکومت کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں بین الاقوامی سطح پر قرضوں کے حصول میں مشکلات نہ پیدا ہو جائیں..... اور یہ بھی کہ کہیں تجارتی سرگرمیاں موقوف نہ ہو جائیں۔ چنانچہ ۳۰ جون کے آنے سے پہلے پہلے مالیاتی اداروں' بینکوں اور بعض افراد نے سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیٹ بینچ میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیلیں دائر کر دیں۔

یہ اپیلیں فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ بن گئیں اور سات سال تک سرد خانے میں پڑی رہیں۔ بالآخر ۱۹۹۹ء کے اوائل میں سپریم کورٹ آف پاکستان میں ایک شریعت ایپلیٹ بینچ تشکیل دیا گیا' جس نے کئی ماہ تک مسلسل ان اپیلوں کی سماعت کی۔ اس پانچ رکنی بینچ میں جناب جسٹس خلیل الرحمٰن خان بطور چیئرمین شریک تھے' جبکہ جناب جسٹس وجیہہ الدین' جناب جسٹس منیر اے شیخ' جناب جسٹس مفتی مولانا تقی

عثمانی اور جناب جسٹس ڈاکٹر محمود احمد غازی بطور ممبر شامل تھے۔ معزز عدالت نے سماعت کے دوران مقدمہ میں زیرِ بحث آنے والے اہم فقہی، معاشی، معاشرتی، قانونی اور آئینی ایشوز پر رہنمائی حاصل کرنے کے لیے فریقین کے وکلاء حضرات کے علاوہ ماہرینِ علم وفن سے بھی اپیل کی کہ وہ زیرِ بحث مسئلہ کے حوالے سے عدالت کی معاونت کریں۔ چنانچہ پاکستان سمیت اسلامی دنیا کے متعدد نامور محققین اور قانون دان حضرات نے فاضل عدالت کو assist کرتے ہوئے اپنی آراء اور تجاویز سے تحریری طور پر اور زبانی مستفید کیا، اور جدید وقدیم معاشی کتب وجرائد کے بے بہا ذخیرے میں سے اہم اقتباسات کی نقول عدالت کے ریکارڈ پر لائی گئیں۔

اس سارے مواد کی چھان پھٹک اور علماء اور وکلاء کی بحثوں کی سماعت کرنے کے بعد سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیٹ بینچ نے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو عمومی طور پر درست قرار دیتے ہوئے جدید بینکاری سمیت تمام دیگر سودی قوانین کو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ممنوع اور حرام قرار دے دیا اور حکومتِ وقت کو مزید مہلت دیتے ہوئے ہدایت جاری کی کہ وہ جون ۲۰۰۱ء تک تمام غیر اسلامی قوانین کو نئے قوانین سے بدل کر بینکنگ سمیت دیگر معاشی معالات کو سود سے پاک کردے۔

شریعت ایپلیٹ بینچ کا یہ فیصلہ ایوان ہائے اقتدار وطبقہ ہائے استحصال کے لیے ایک شمشیرِ برہنہ کی صورت اختیار کر گیا اور اُن تمام مفاد یافتہ طبقات نے یک زبان اعلیٰ عدالت سے ''دادرسی'' کے لیے رجوع کیا جن کے مفادات پر حرف آنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جون ۲۰۰۱ء آنے سے پہلے پہلے حکومت نے ایک درخواست شریعت بینچ کے سامنے دائر کی جس میں فاضل عدالت سے درخواست کی گئی تھی کہ سودی نظام کو ختم کرنے کے لیے مزید دو سال کی مہلت دی جائے۔ بظاہر یہ درخواست حکم امتناعی کی عرضی تھی جو جون ۲۰۰۱ء سے پہلے ہی UBL کے ذریعے داخلِ دفتر کروائی گئی تھی۔ چنانچہ اس عرضی کی بنیاد پر عدالت نے درخواست منظور کرتے ہوئے دو سال کی بجائے ایک سال کی مہلت دی اور ہدایت کی کہ جون ۲۰۰۲ء تک مطلوبہ آئینی وانتظامی اقدامات مکمل کر لیے جائیں۔ ایمانداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ حکومتِ وقت اپنی استدعا پر حاصل ہونے والی اس مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے خلوصِ نیت کے ساتھ قوانین کی تبدیلی کا کام مکمل کرتی۔ لیکن عملاً کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہ کی گئی، بلکہ حسبِ معمول سود کی بنیاد پر نئی سکیموں کا اجراء اور نئے قرضے حاصل کرنے کا اہتمام کیا جاتا رہا۔

جب عدالت کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے کو آئی تو UBL کی جانب سے اب نظرِ ثانی کی ایک درخواست عدالت میں داخل کی گئی۔ اس دوران ایک بڑا واقعہ یہ رونما ہو چکا تھا کہ PCO پر حلف نہ اٹھانے کی بنا پر جسٹس خلیل الرحمٰن خان اور جسٹس وجیہہ الدین احمد ریٹائر کر دیے گئے، جسٹس محمود احمد غازی بھی ایک اور حکومتی عہدے پر فائز ہونے کی بنا پر شریعت ایپلیٹ بینچ کا حصہ نہ رہے۔ صرف جسٹس منیر اے شیخ اور جسٹس مفتی مولانا محمد تقی عثمانی بطورِ فاضل جج بینچ کا حصہ باقی رہ گئے۔ لیکن سماعت سے متصلاً قبل ایک بڑا ''دھماکہ'' یہ کیا گیا کہ جسٹس مولانا تقی عثمانی کو، جو سود سے متعلق اپیل کا فیصلہ لکھنے والے ججوں میں شامل تھے اور اپنی علمی ودینی وجاہت کے اعتبار سے باقی تمام ججز میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے، بغیر کوئی وجہ بتائے ایپلیٹ بینچ سے فارغ کر دیا گیا، اور علماء نشستوں پر نئے بینچ میں جناب علامہ خالد محمود اور جناب رشید احمد جالندھری کو شامل کر لیا گیا۔ اس طرح نظر ثانی

کی درخواست کی سماعت جس بینچ نے کی اُس میں سابقہ بینچ کے شرکاء میں سے صرف جسٹس منیر اے شیخ باقی رہ گئے اور باقی تمام حضرات کی نئے ججز کے طور پر تقرری عمل میں لائی گئی۔ چنانچہ اس نئے بینچ میں جسٹس شیخ ریاض احمد کو بطور چیئرمین منتخب کیا گیا جبکہ جسٹس قاضی محمد فاروق، جسٹس ڈاکٹر خالد محمود اور جسٹس رشید احمد جالندھری کو اس بینچ کا حصہ بنا دیا گیا۔

اس نئے تشکیل کیے گئے شریعت ایپلیٹ بینچ میں ہونے والی کارروائی کی تفصیلی روداد جناب جسٹس وجیہہ الدین احمد کی کتاب ''میزان'' میں تفصیلاً تحریر کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نظرِ ثانی کی اس درخواست پر UBL کے وکیل راجہ محمد اکرم نے ۱۲ جون ۲۰۰۲ء کو بحث کا آغاز کیا۔ راجہ اکرم نے قرآنِ مجید کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کی کہ جدید بینکنگ کا نظام ''بیع'' کے وسیع تر مفہوم پر پورا اترتا ہے، اس لیے بینک انٹرسٹ کو ربا قرار دے کر ممنوع کر دینا درست نہیں۔ گویا یہ بات از سرِ نو طے کی جائے کہ بینک انٹرسٹ ربا ہے یا نہیں...؟ نیز انہوں نے یہ موقف بھی اختیار کیا کہ اسلام کے نزدیک سود کی صرف ظالمانہ شرح ہی ناجائز ہے اور سمپل انٹرسٹ اُن کے بقول ظالمانہ نہیں۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ سود کی تعلیمات قانونی درجے کی نہیں ہیں بلکہ اخلاقی درجے کی ہیں، اس لیے سود کی ممانعت بذریعہ قانون نافذ کرنا انصاف کے مطابق نہیں۔

حکومتِ پاکستان کے وکیل رضا کاظم نے دلائل کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ حکومت UBL کی درخواست اور معروضات سے پورا اتفاق کرتی ہے۔ شریعت ایپلیٹ بینچ اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں پر عمل درآمد ناممکن ہے۔ انہوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ربا اور سود کے امتناع سے ملک میں معاشی انارکی پھیلے گی اور تمام کاروبارِ معیشت درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لیے انہوں نے سابقہ فیصلے کی تنسیخ کا مطالبہ کیا اور یہ دعویٰ بھی کیا کہ حکومت نے غیر سودی نظام نافذ کرنے کے سلسلے میں ۵۳ اسلامی ممالک سے رابطہ کیا ہے، لیکن تمام ممالک نے یہی مشورہ دیا ہے کہ سود سے پاک بینکنگ کا نظام ناقابلِ عمل ہے..... بلکہ یہ بھی کہ یہ معیشت کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا..... اور اس طرح ہم بین الاقوامی برادری سے کٹ جائیں گے..... اور ہمارا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔

اس مرحلے پر حکومتی وکیل نے اپنے ساتھی ڈاکٹر ریاض الحسن گیلانی کو بھی عدالت کے سامنے اپنی معروضات اور دلائل دینے کے لیے پیش کیا۔ ڈاکٹر ریاض الحسن گیلانی نے اپنے مخصوص انداز میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سابقہ بینچ نے قرآن وسُنّت کے متعدد احکامات سے انحراف کیا ہے، امام ابوحنیفہؒ اور دیگر فقہاء کے نظریات کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان کے تمام شہریوں کو، چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ایک ہی لاٹھی سے ہانکا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دعووں کے حق میں قرآن وسنت اور امام ابوحنیفہ کے اقوال سے واضح ثبوت فراہم نہیں کیے، تاہم دعوے اس اذعان کے ساتھ کیے کہ گویا..... جو کہا ہے بالکل درست ہے۔

ڈاکٹر ریاض الحسن گیلانی کے بعد اٹارنی جنرل آف پاکستان مخدوم علی خان نے بھی عدالت کے سامنے سابقہ فیصلوں پر تنقید کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ وفاقی شرعی عدالت اور شریعت ایپلیٹ بینچ نے سماعت

کرتے ہوئے آئینِ پاکستان کے آرٹیکل 29، 30(2)، 38(F)، 81(C)، 121(C) میں بیان کیے گئے ضوابط کے مطابق نہ تو اپنے اختیاراتِ سماعت کا خیال رکھا اور نہ ہی اس بات کا کہ وفاقی شرعی عدالت یا شریعت ایپلیٹ بینچ کے سامنے یہ مقدمات دائر بھی کیے جاسکتے ہیں یا نہیں۔ دوسری طرف سے جناب محمد اسمٰعیل قریشی، جناب جسٹس (ریٹائرڈ) خضر حیات اور جناب حشمت علی حبیب نے بھی عدالت کے سامنے دلائل پیش کیے اور انہوں نے موجودہ بینچ کی تشکیل پر اعتراض کرتے ہوئے یہ نکتہ بھی اٹھایا کہ بینچ آئین کے ضوابط کے مطابق تشکیل نہیں دیا گیا۔ نیز یہ دلیل بھی پیش کی گئی کہ نظر ثانی کے معاملے میں عدالت کے اختیارات بہت محدود ہوتے ہیں۔ اور جن قوانین، ضوابط اور حقائق کا جائزہ فیصلہ دینے والی عدالت عظمیٰ تفصیل سے لے چکی ہو انہیں نظر ثانی کی آڑ میں دوبارہ نہیں اٹھایا جاتا، جبکہ مخالف وکلاء نے جن امور کو نظر ثانی کی بنیاد بنایا ہے ان سب پر تفصیل سے بحث وسماعت کرنے کے بعد ہی سابقہ فیصلے صادر کیے گئے تھے۔ یہ دلیل بھی پیش کی گئی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر جزوی عمل ہو چکا ہے، اب قانون اس پر نظر ثانی کی اجازت نہیں دیتا۔

چند دن کی مختصر سماعت کے بعد نظر ثانی کے لیے تشکیل کردہ بینچ نے انتہائی عجلت میں ۲۴ جون ۲۰۰۲ء کو اپنا فیصلہ سناتے ہوئے شریعت ایپلیٹ بینچ کا ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کا فیصلہ اور وفاقی شرعی عدالت کا ۱۴ نومبر ۱۹۹۱ء کا فیصلہ بیک جنبشِ قلم منسوخ کر دیا اور مقدمے کو ازسرِ نو سماعت کے لیے دوبارہ وفاقی شرعی عدالت میں بھیجنے کے احکامات صادر کر دیے۔ اس طرح اس عدالت نے سابقہ نصف صدی کی طویل کوششوں اور جاں گسل محنتوں کو صفر سے ضرب دے کر معاملہ وہاں پہنچا دیا کہ گویا ہنوز روزِ اوّل است!

مذکور بالا تاریخی حقائق کو سامنے رکھا جائے تو چند اہم سوالات بلکہ اشکالات سر اٹھاتے ہیں:

۱) سب سے پہلا اشکال یہ ہے کہ ''نظرِ ثانی'' اور ''اپیل'' میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ اپیل میں نئے سوالات کی محدود حد تک پذیرائی ہوسکتی ہے مگر نظرِ ثانی میں نئے سوالات نہیں اٹھائے جاسکتے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ عدالت نے نہ صرف نئے سوالات اٹھانے دیے بلکہ اُن نئے سوالات کی بنیاد پر وفاقی شرعی عدالت اور شریعت ایپلیٹ بینچ کے فیصلوں کو بھی رد کر دیا؟

۲) اس فیصلے کا سب سے نمایاں وصف بلکہ نقص یہ ہے کہ اس بینچ کے جج صاحبان نے وہ وجوہات بیان ہی نہیں کیں جن کی بنیاد پر وہ اتنے اہم اور دُور رَس فیصلوں کو کالعدم قرار دے رہے تھے۔ فیصلے میں صرف وہ بحثیں نقل کی گئیں ہیں کہ فلاں وکیل نے یہ کہا اور فلاں نے یہ۔ اور جن وکلاء کے دلائل نقل کیے گئے ہیں وہ بھی صرف وہ ہیں کہ جنہوں نے سابقہ فیصلے کے خلاف دلائل دیے۔ دوسری طرف کے وکلاء کی بحثوں اور دلائل کو قابل ذکر ہی خیال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح نہ تو دلائل کو پرکھا گیا اور نہ ہی انہیں یکجا کر کے بتایا گیا کہ یہ یہ وجوہات ہیں کہ جن کی بنیاد پر نظرِ ثانی کی جارہی ہے اور یہ یہ وجوہات ہیں کہ جن کی بنا پر سابقہ فیصلوں کو کالعدم قرار دینا ناگزیر قرار پاتا ہے۔ کیا اس طرح سے دیے گئے فیصلے کا کوئی تقدس باقی رہ جاتا ہے؟

۳) نظرِ ثانی کی سماعت کرنے والے فاضل اراکینِ بینچ (جو PCO پر بھی حلف اُٹھائے ہوئے تھے) کی اہلیت،

نیک نامی اور علمی مرتبہ ۱۹۹۹ء کے شریعت ایپلیٹ بینچ میں شامل فاضل ججز کے مقابلے میں کہیں کم نظر آتا ہے۔ عوامی رائے کے مطابق موجودہ بینچ کسی بھی اعتبار سے سابقہ بینچ کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود موجودہ بینچ اَخلاقی وقانونی norms کو بائی پاس کرتے ہوئے سابقہ دونوں عدالتوں کے فیصلوں کو کالعدم قرار دے رہا ہے...' گویا نظرثانی کی PCO عدالت شاید سپریم کورٹ کی آزاد عدالت سے بھی بالاتر کوئی عدالت تھی؟ آخر ایسا کیوں ہوا؟

۴) ۱۹۹۹ء کے بینچ نے جب ربا کے کیس کی سماعت شروع کی تو ہفتہ بھر تک وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ پڑھوا کر کورٹ میں سنا۔ جبکہ ۲۰۰۲ء کی عدالت نے نہ تو سماعت کے دوران وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ سنا اور نہ ہی شریعت ایپلیٹ بینچ ۱۹۹۹ء کا فیصلہ سنا گیا۔ کیا اس طرح اس فیصلے کی حیثیت قانونی اور اخلاقی طور پر مجروح نہیں ہو جاتی؟

۵) سب سے اہم اشکال یہ ہے کہ اگر سابقہ عدالتوں کے فیصلے میں کچھ نقائص رہ گئے تھے تو موجودہ نظرِثانی کے بینچ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اتنے اہم سوالات کی خود سماعت کرتی اور پھر اُن پر اپنا فیصلہ سناتی' ایسا کیوں نہ کیا گیا؟ اس کے برعکس سابقہ دونوں فیصلوں کی نفی کرتے ہوئے سود کے مقدمے کو دوبارہ ایک نچلی عدالت میں بھیجنے کا صاف مطلب تو یہی نظر آتا ہے کہ پھر ایک طویل عرصے کے لیے سود پر مبنی ظالمانہ غیر اسلامی نظام کو غیر معیّنہ مہلت دے کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کر دیا گیا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اب سود کا مقدمہ ایک مرتبہ پھر اپنے بالکل ابتدائی مرحلے میں پہنچ کر وفاقی شرعی عدالت کے سامنے ہے اور اس میں ۲۰۰۲ء کی PCO عدالت کے فیصلے کے ذریعے بہت سے ایسے مباحث کو دوبارہ کھول دیا گیا ہے جن پر سابقہ دو مقدمات میں تفصیل کے ساتھ بحث ہو چکی ہے اور بہت وضاحت کے ساتھ فیصلہ دیا جا چکا ہے' اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے مباحث کا ڈول بھی ڈال دیا گیا ہے جو اس مقدمے کو ایک نئی جہت کی طرف لے جانے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ دوسری جانب حکومتِ پاکستان اپنے آئین کی رو سے اس بات کی پابند ہے کہ سود کو ختم کرے' جس کے حکومت نے بارہا وعدے بھی کیے ہیں۔ اب وفاقی شرعی عدالت نے نظرِثانی کے لیے مقدمہ کی سماعت شروع کر دی ہے۔ فاضل عدالت سے ہماری یہ درخواست ہے کہ وہ اپنے سابقہ فیصلہ کو بحال کر دے اور حکومت کو اس کی تنفیذ کے لیے اقدامات کرنے کا حکم جاری کر دے۔ فاضل عدالت کے سابقہ فیصلہ پر پہلے بھی دنیا بھر کے علماء وفقہاء اور دینی جماعتوں نے اظہارِ مسرت کیا اور فاضل عدالت کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اب بھی فاضل عدالت اپنا فیصلہ بحال کرے گی تو یہ اُمتِ مسلمہ کی عظیم خدمت ہو گی اور عدالت کا فیصلہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ ان شاء اللہ!

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِہَا